بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ - جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ عوام کی عدالت نے مشرقی پاکستان کے لیے عوامی لیگ اور مغربی پاکستان کے دو بڑے صوبوں کے لیے (جو عملاً پورے مغربی پاکستان پر حاوی ہیں) پاکستان پیپلز پارٹی کے حق میں اپنے اعتماد کا فیصلہ دے دیا ہے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں جناب مجیب الرحمٰن اور جناب ذوالفقار علی بھٹو کے سر پر اقتدار کا تاج رکھ دیا ہے۔ عوام کی عدالت نے یہ فیصلہ اگرچہ جذبات کی رَو میں بہہ کر اور خوش آئند نعروں کے فریب میں آکر کیا ہے، مگر ہم جمہوریت کے حامی ہونے کی حیثیت سے اس فیصلے کو قبول کرتے ہیں اور خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ ان جماعتوں اور ان رہنماؤں کو ملک و ملت کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق دے اور اہلِ پاکستان کی قوتیں اور صلاحیتیں صرف اکھاڑ پچھاڑ ہی میں ضائع نہ ہوتی رہیں۔

اس ملک میں جمہوریت کی راہ ہموار کرنے میں جو کردار جنرل محمد یحییٰ خان نے ادا کیا ہے وہ قابلِ قدر ہے اور ہم اُن سے بجا طور پر اس بات کی توقع رکھتے ہیں کہ تدوینِ دستور کے معاملے میں بھی وہ اُن وعدوں کو پورا کریں گے جو انھوں نے آئین کے اسلامی مزاج، نظریۂ پاکستان کے تحفظ اور ملکی سالمیت کے بارے میں قوم سے کیے ہیں۔

جہاں تک ان انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی "ناکامی" کا تعلق ہے ہمیں اس پر افسوس ضرور ہے کیونکہ ہم ایمانداری سے یہ سمجھتے ہیں کہ قوم نے بہت بڑا دھوکا کھایا ہے، مگر اس سے دل گرفتہ نہیں، کیونکہ خدا کے حضور میں ہم اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ ہم نے اپنی قوم کو کوئی دھوکا اور فریب نہیں دیا، ناجائز

ہتھکنڈوں سے اس کے سر پر سوار ہونے کی کوئی کوشش نہیں کی اور اس کو حق و صداقت کی راہ دکھانے کے لیے اپنے وسائل کی حد تک جو کچھ ہم کر سکتے تھے وہ کیا۔ مگر ایک طوفان اُسے بہا کر غلط سمت میں لے گیا۔ قوم کے اس غلط اقدام کے کیا نتائج ہوں گے، اُن کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مگر ہم پوری شدّت سے اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہُوا ہے آناً فاناً نہیں ہُوا، بلکہ تقسیمِ ملک کے وقت ہی سے حالات جو رُخ اختیار کر رہے تھے یہ سب اُس کے منطقی نتائج ہیں اور اب بھی اگر سنبھلنے کی کوشش نہ کی گئی تو صورتِ حال مزید بگڑے گی۔ مالک الملک سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں حق و صداقت کے راستہ پر گامزن رکھے اور اس طوفان کے نتائجِ بد سے بچالے۔

ان صفحات میں ہم پہلے اُن اسباب و وجوہ سے بحث کرنا چاہتے ہیں جن سے یہ طوفان برپا ہُوا اور اس کے بعد موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حالات کو کس طرح صحیح رُخ پر موڑا جا سکتا ہے۔ کسی قوم کی اس سے زیادہ بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُسے ۲۲ سال تک حقِ رائے دہی سے محروم رکھا جائے۔ ہمارا ہمسایہ ملک بھارت جو ہمارے ساتھ ہی آزاد ہُوا تھا، اب پانچویں انتخابات کی تیاریاں کر رہا ہے مگر ہمارے ہاں اب پہلی مرتبہ انتخابات ہوتے ہیں۔ پھر گذشتہ تئیس سالوں میں بھی نہ صرف یہ کہ انتخابات نہیں ہوئے بلکہ ہر وہ حربہ اختیار کیا گیا جس سے قوم کا پاکستان کی نظریاتی اساس یعنی اسلام سے تعلق منقطع ہو اور جس سے جمہوریت کی رُوح کو فنا کرنے میں مدد ملے۔ پہلے نو سال تو دستور کی تدوین کے بارے میں کش مکش رہی جو کام زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ سال کے عرصہ میں مکمل ہو جانا چاہیے تھا اس میں ایک طویل مدت ضائع ہو گئی۔ اوّل روز ہی سے اس ملک کا با اثر اسلام بیزار طبقہ اس بات کے لیے مسلسل کوشاں رہا کہ دستور لادینی بنیادوں پر بنایا جائے۔ مگر عوام کی عظیم اکثریت اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ عوام کے منشا اور مرضی کے علی الرغم غیر اسلامی نظامِ زندگی مسلط کرنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ جمہوریت نہ آنے پائے، آمریت کو اس ملک میں پنجے گاڑنے کے مواقع فراہم ہو جائیں اور اس کی قوت سے لادینی نظریات کو فروغ حاصل ہو اور عوام اس پُورے المیہ کو بے بسی اور مجبوری کے عالم میں دیکھتے رہیں۔

اِس ناپاک مقصد کے حصُول کے لیے پُوری کوشش کی گئی کہ عوام جس اسلام کے معاملے میں تقسیمِ ملک کے وقت بالکل یکسُو تھے اور جس کی عمل داری ہی کے لیے انہوں نے پاکستان حاصل کیا تھا، اُسی اسلام کے بارے میں اُن کے ذہنوں کے اندر مختلف شکوک و شبہات پیدا کیے جائیں۔ اس "کارِ خیر" کے لیے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ادارے قائم کیے گئے اور ہر اُس شخص یا جماعت کی حکومت نے سرپرستی کی جو اسلام کو ایک ناقابلِ عمل اور فرسودہ نظامِ زندگی ثابت کرنے میں مصروف تھا، یا اسلام کے متفق علیہ امور کو بھی اختلافی بنانے پر تُلا ہوا تھا۔

اس کے علاوہ ایک منظم اسکیم کے تحت لوگوں کے اخلاق، خصوصاً نوجوان نسل کے اخلاق کو بگاڑنے کے لیے مختلف تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ ثقافت اور آرٹ کے نام پر اُن کے اندر بے حیائی پھیلائی گئی۔ فکری آزادی اور روشن خیالی کے نام پر انہیں بُرائیوں کا خوگر بنایا گیا۔ غیر سنجیدہ طرزِ عمل اور ہنگامہ آرائی کی انہیں باقاعدہ تربیت دی گئی۔ ان ساری کارروائیوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ کسی طرح نوجوان نسل کو اخلاقی اعتبار سے اس قدر بگاڑ دیا جائے کہ وہ ذہنی اور عملی طور پر اسلامی نظام کے قابل نہ رہے اور اگر وہ عوامی دباؤ کے تحت کبھی اس کی گرفت میں آبھی جائے تو وہ اس سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

یہ تھیں وہ ساری کارروائیاں جو نظریاتی اور سیاسی میدان میں اسلام کی راہ روکنے کے لیے کی گئیں۔ معاشی اور انتظامی دائروں میں بھی ہر وہ کام کیا گیا جس سے عوام کے اندر بے چینی اور طبقاتی کش مکش پیدا ہو۔ ظالمانہ جاگیرداری نظام جس کے چنگل میں یہاں کے کسان پہلے سے گرفتار تھے، اُسے ختم کرنے اور عوام کو جاگیرداروں کے جبر و استبداد سے بچانے کے بجائے اُسے نہ صرف مزید فروغ دیا گیا بلکہ اور زیادہ مستبد اور جابرانہ بنا دیا گیا۔ سرکاری اراضی مزارعین میں تقسیم کرنے کے بجائے سیاسی رشوت کے طور پر بڑے بڑے حکام اور زمینداروں میں اندھا دھند بانٹ دی گئیں۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں سرمایہ داری کو غیر معمولی تقویت پہنچائی گئی۔ سرمایہ کاری کے دائروں کو صرف چند خاندانوں کے لیے وقف کر دیا گیا اور انہیں ناجائز استحصال کے پورے پورے مواقع فراہم کیے گئے۔ غیر ملکی قرضوں کے سارے فائدے بڑے سرمایہ داروں نے حاصل

کیسے اور اُن کا بوجھ غریب عوام پر لاد دیا گیا۔ ضروریاتِ زندگی کی ہوش رُبا گرانی سے عوام کی کمر ٹوٹ گئی مگر ان زرداروں کو اپنی لُوٹ کھسوٹ کی فکر رہی۔ ان کے اندر کبھی یہ احساس پیدا نہ ہُوا کہ دولت کے ان انباروں سے غریب محنت کشوں کو بھی کوئی حصّہ ملنا چاہیے۔ حکومت کی تجارتی پالیسی نے مسابقت کی ساری راہیں مسدود کر دیں اور صنعت و تجارت کے سارے منافع ایک محدود طبقے کے ہاتھ میں سمٹ کر رہ گئے۔

ایک طرف جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے عام انسانی زندگی کو بالکل عذاب بنا رکھا تھا تو دوسری طرف نوکر شاہی طبقے نے عوام کے ساتھ ایک ایسی غلط اور ظالمانہ روش اختیار کر رکھی تھی جو ہر لحاظ سے اس انداز کی تھی کہ گویا یہ کسی دوسری قوم کے لوگ ہیں جو اپنے ملک پر نہیں بلکہ کسی غیر ملک پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ غیر ملکی سامراج کے پروردہ لوگ تھے، اور غیر ملکی سامراج اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے نوکر شاہی کو جس انداز کی تربیت دیتا ہے۔ اور پھر اُسے جس طرح استعمال کرتا ہے، اس سے کون ناواقف ہے؟ نخوت و تکبّر، عوامی احساسات سے بے حسی اور بے پروائی، زیردست آزاری؛ یہ وُہ عام خصائص ہیں جو غیر ملکی سامراج اپنے محکوم ملک میں انتظامیہ کے کارکنوں کے اندر پیدا کرتا ہے۔ اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام انتظامیہ کو جبر اور قہر کی طاقت سمجھ کر اس کے سامنے دم بخود رہیں اور سامراج جونک کی طرح اُن کا خون چوستا رہے۔ آزادی کے بعد اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ انتظامیہ کے اس غلط مزاج کو بدلا جائے اور یہ انتظامیہ وہ روش اختیار کرے جو ایک قوم کے حکام کو خود اپنی قوم کے اندر حکومت کرنے کے لیے اختیار کرنی چاہیے۔ مگر اس افسوسناک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نہ صرف انتظامیہ کا مزاج وہی رہا جو انگریزی دور میں تھا بلکہ اس میں مزید خرابیاں پیدا ہوئیں۔ اس کی متعدد وجوہ تھیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگیں آئیں وُہ اپنے سامنے کوئی نظریاتی پروگرام نہ رکھتے تھے، بلکہ زیادہ سے زیادہ مدت تک سیاسی اقتدار بہر طور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے عوامی تائید کے بل پر حکومت کرنے کے بجائے نوکر شاہی کے بل پر حکومت کرنے کی کوشش کی اور ہر قدم پر اقتدار کی رسہ کشی میں اس سے مدد لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انتظامیہ روز بروز زور پکڑتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اصل اقتدار عوام کے نمائندوں کے بجائے اس کے

ہاتھ میں چلا گیا۔ دوسرے انتظامیہ کے فکر و نظر میں تبدیلی کے لیے تربیت کا کوئی انتظام نہ کیا گیا۔ جن بُری صفات سے انگریزی حکومت انتظامیہ کو متصف دیکھنا چاہتی تھی انہی صفات، بلکہ اس سے بدتر صفات کی پرورش کا آزادی کے بعد بھی برابر انتظام کیا جاتا رہا۔ عوام اس صورتِ حال سے سخت رنجیدہ ہوتے اور وُہ یہ محسوس کرنے لگے کہ آزادی کے بعد بھی وہ نوکر شاہی کے غلام ہیں۔

جاگیرداری، سرمایہ داری اور نوکر شاہی کی ملی بھگت نے حالات کو عوام کے لیے بالکل ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ مگر وہ اِس آس پر جیتے رہے کہ شاید دستور کی تدوین کے بعد اُن کی محرومیوں کی شبِ تاریک کا خاتمہ ہو اور پاکستان کی سرزمین کو اسلام کی ضیا پاشیاں منور کر دیں۔ نو سال کی مسلسل کش مکش کے بعد ۱۹۵۶ء کا دستور بنا۔ اگرچہ اس دستور کو صحیح معنوں میں اسلامی دستور نہیں کہا جا سکتا تھا، تاہم اس میں اس بات کی گنجائش تھی کہ اگر انتخابات کے ذریعہ عوام کے صحیح نمائندے آکر اس کو چلانے کی کوشش کرتے تو ملک کو اسلامی ریاست بنایا جا سکتا تھا اور دستور کے نقائص بھی دُور کیے جا سکتے تھے۔ مگر اس دستور کے پاس ہونے کے ساتھ ہی بے دین عناصر نے اس کے خلاف جدوجہد شروع کر دی۔ ان میں سے ایک فریق نے بڑی عیاری کے ساتھ اسلام کا راستہ روکنے کے لیے اِس دستور میں مخلوط انتخاب کا اَڑنگا لگا دیا جس سے مشرقی پاکستان کی سیاست کا مزاج یکسر تبدیل ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کی حد تک مخلوط انتخاب کا مطلب یہ تھا کہ وہاں جو شخص یا پارٹی اسلام کا نام لے وہ ہندوؤں کی تائید سے محروم ہو جاتے، اور جو شخص یا پارٹی کوئی لادینی پروگرام لے کر آئے وہ ہندوؤں کے پُورے ووٹ لے کر مسلمانوں کی صرف تھوڑی سی تعداد کی تائید حاصل کر کے کامیاب ہو جاتے۔ چنانچہ وہاں اُن پارٹیوں اور لیڈروں نے سر اٹھایا جنہیں ہندوؤں کی تائید حاصل تھی۔ اس سے مُلحد اور دین سے بیزار عناصر کو شہ ملی اور انہوں نے اس نئی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی میدان میں قسمت آزمائی شروع کر دی۔ اُنہیں جب اس امر کا یقین ہو گیا کہ اب اگر انتخابات ہوں تو تختِ اقتدار پر صرف اُن کا ہی قبضہ ہو گا تو پھر انتخابات کے لیے آمادگی کا اظہار کیا گیا۔ پھر انتخابات کے اعلان کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان میں تمام وہ ہتھکنڈے استعمال کیے گئے جن سے ووٹروں کو مرعوب کیا جا سکتا تھا۔ دھونس دھمکی

لالچ، جھوٹے وعدے، غنڈہ گردی کے مظاہرے، یہ وہ عام حربے تھے جن کو کام میں لاکر فضا کو اپنے حق میں ہموار کیا جانے لگا۔ اپنے ڈھب کے افسروں کو اپنے اپنے حلقوں میں تعینات کروانے کے لیے وسیع پیمانے پر تگ و دو کی گئی تاکہ انتظامیہ سے بھی انتخاب جیتنے میں پوری طرح کام لیا جائے جس طرح ۱۹۵۱ء کے صوبائی انتخابات میں لیا گیا تھا۔ بہ صورتِ حال کسی اعتبار سے بھی جمہوریت کی راہ ہموار کرنے کے لیے موزوں نہ تھی اور حالات کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ جمہوریت کی صبح طلوع ہونے کے بجائے آمریت اپنے تاریک سایے پھیلانے کے لیے منتظر ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے سات اور آٹھ اکتوبر ۵۸ء کی درمیانی شب کو موچی دروازہ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے ان خطرات کی بڑے واضح الفاظ میں نشاندہی کی اور قوم کو متنبہ کیا کہ زبردستی انتخابات جیتنے کے لیے جو حربے استعمال کیے جا رہے ہیں ان کا نتیجہ یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی سیاسی پارٹی جیت کر برسرِ اقتدار آجائے، بلکہ ان سے جمہوریت کی موت واقع ہو جائیگی اور بعید نہیں کہ کوئی اچانک انقلاب ہمارے سروں پر کسی ڈکٹیٹر کو مسلط کر دے۔ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا کی تقریر رات ساڑھے دس بجے ختم ہوئی اور اسی رات بارہ بجے دستور منسوخ کر دیا گیا، پارلیمنٹ توڑ دی گئی، وزارتیں رخصت کر دی گئیں اور ملک میں مارشل لا کے نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔ اس طرح ملک جمہوریت کی عین دہلیز پر پہنچ کر آمریت کے چنگل میں دس سال تک کے لیے گرفتار ہو گیا۔

ان دس سالوں میں ملک کو برباد کرنے اور قوم کو ذہنی، اخلاقی، جمہوری اور اقتصادی طور پر تباہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ ایوب صاحب نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ ملک میں ہر اُس شخصیت کو ذلیل اور ہر اُس جماعت کو بدنام کرنے کی کوشش کی جس کے متعلق انہیں اس بات کا معمولی سا گمان بھی تھا کہ وہ عوام میں مقبول ہو کر اُن کی قیادت کے لیے کسی وقت بھی خطرہ کا باعث بن سکتی ہے۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ "نوازش" جماعت اسلامی اور اس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر کی گئی۔ اُن کے خلاف جھوٹے پراپیگنڈے، دشنام طرازی اور افترا پردازی کی باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ اس پر بے تحاشا روپیہ خرچ کیا گیا۔ بکثرت کتابیں ان کے خلاف لکھوائی گئیں۔ گالیاں دینے والوں کے

عمل کے غول ان کے پیچھے چھوڑ دیئے گئے۔ اور جس فرد یا گروہ نے اس معاملے میں جس قدر عملی سرگرمی کا مظاہرہ کیا اسی نسبت سے حکومت نے اس کی سرپرستی بھی کی اور پیٹھ بھی ٹھونکی۔ ایوب صاحب کے دور میں یوں محسوس ہوتا تھا کہ نشر و اشاعت کے سارے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے صرف اسی کام میں مصروف ہیں اور یہ حکومت کے پروگرام کا کوئی بڑا ہی اہم حصہ ہے۔ جو لوگ بھی اس زمانے کے حالات کو دیکھتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ پوری حزبِ اختلاف اور اس کے لیڈروں کو بدنام کرنے کے لیے حکومت نے جتنا زور لگایا اس سے کم از کم پچاس گنا زیادہ زور تنہا جماعت اسلامی اور اس کے امیر کو بدنام کرنے کے لیے صرف کر دیا۔

سرمایہ داری جو پہلے ہی عوام پر عذاب کی صورت میں مسلط تھی اس کی ریشہ دوانیوں میں ناقابلِ بیان حد تک اضافہ ہوا۔ ہر وہ فرد جو آمریت کے ہاتھ مضبوط کرنے میں ذرا بھی ممد و معاون ثابت ہوا اس پر سُن برسنے لگا۔ اس بہتی گنگا سے ہر طالع آزما اور مفاد پرست نے خوب دل کھول کر ہاتھ دھوئے۔ ضمیر فروشی کا باقاعدہ کاروبار کھل گیا اور قوم کو اس کی خوب مشق کرائی گئی۔ ملک میں آب پاشی کے نئے نئے منصوبوں کی مدد سے جتنی نئی زمینیں قابلِ کاشت بنائی گئیں وہ کاشت کاروں کو ملنے کے بجائے حکومت کے اور ایوب صاحب کے خوشامدیوں اور بہی خواہوں میں تقسیم کی گئیں اور اس طرح جاگیرداروں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ زرعی اصلاحات جن کا ایوبی دور کے آغاز میں بڑا غلغلہ بلند ہوا تھا، عملی طور پر کسانوں اور مزارعین کی حالت بہتر بنانے میں بالکل ناکام رہیں۔ ان اصلاحات میں ایسے رخنے اور چور دروازے چھوڑ دیئے گئے جن سے جاگیردار اچھی طرح فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ ملک کے قریب قریب تمام بڑے زمینداروں نے حکومت کی عافیت میں پناہ لے کر اُن سے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاشت کاروں کی حالت مزید بگڑ گئی۔

آمریت کا ایک یہ خاصہ بھی ہوتا ہے کہ اس میں نمائشی کام بڑے ذوق و شوق سے کیے جاتے ہیں تاکہ عوام کو اُن کے سحر میں گرفتار رکھ کر ترقیات کے تماشے دکھائے جائیں اور اصلی صورتِ حال سے

بے خبر رکھا جائے۔ فیلڈ مارشل صاحب کے دورِ اقتدار میں بھی اسی پالیسی پر بڑے شدومد کے ساتھ عمل کیا گیا۔ مشہور شہروں اور دارالحکومتوں میں یکایک سر بفلک عمارات اور جدید بستیاں تعمیر کی جانے لگیں۔ بغیر کسی منصوبہ بندی کے مختلف کارخانے قائم کر دیئے گئے اور تجارتی زندگی میں اچانک زبردست ہلچل پیدا ہوئی۔ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا کہ ملک کے عوام اور غیر ملکی سیاحوں کے دل و دماغ میں یہ تاثر قائم کیا جائے کہ پاکستان معاشی اعتبار سے حیرت انگیز ترقی کر رہا ہے۔ مگر یہ ساری ترقی اس بگڑے ہوئے رئیس زادے کی سی تھی جو قلاش ہونے کے باوجود محض قرض کے بل بوتے پر اپنی امارت کی جھوٹی ساکھ قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارا یہ غریب اور مفلوک الحال ملک اپنے وسائل کے بل پر ان عیاشیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نمائشی اقتصادی ترقی کے بھرم کو قائم رکھنے کے لیے دوسرے ممالک سے اندھادھند قرضے لیے جانے لگے۔ ۱۹۵۸ء یعنی ایوب خان کے اقتدار سے پیشتر پاکستان پر غیر ملکی قرضوں کا بوجھ صرف اٹھاسی کروڑ نو لاکھ تھا۔ مگر ۳۱ دسمبر ۱۹۶۷ء تک قرضے کی رقم دس ارب، اکتیس کروڑ چار لاکھ تک جا پہنچی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ملک کو ہر سال پندرہ کروڑ، پچیس لاکھ روپے کی رقم بطورِ سود ادا کرنی پڑتی ہے۔

اندرونِ ملک بھی مالیاتی نظام بالکل تہ و بالا ہو کر رہ گیا۔ ایک طرف تو محاصل خصوصاً بالواسطہ محاصل، جن کا زیادہ تر بار غریبوں اور متوسط طبقے کو اٹھانا پڑتا ہے، کی بھرمار ہو گئی اور دوسری طرف افراطِ زر نے ضروریاتِ زندگی میں ہوشربا گرانی پیدا کی۔ افراطِ زر نے جس طرح ملکی معیشت کو متاثر کیا ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹ اپریل ۱۹۶۹ء تک چھ ارب، ایک کروڑ ۷۷ لاکھ روپے بطور زرِ گردش میں تھے۔ بنکوں کے اعتباری زر اور قرضے اور تبادلے کے دوسرے مصنوعی ذرائع اس پر مستزاد تھے۔ ان حالات نے غریب طبقوں کے لیے جن معاشی پریشانیوں اور محرومیوں کو جنم دیا ہے ان کا ہر وہ شخص بخوبی اندازہ کر سکتا ہے جو اس معاشرے میں آنکھیں کھول کر چلتا پھرتا ہے۔

اس ملک کے بے دین عناصر خصوصاً اشتراکیت کے حامیوں نے یوں تو شروع ہی سے عجیب و غریب

طرزِ عمل اختیار کر رکھا تھا مگر خاص طور پر ایوب صاحب کے عہدِ اقتدار میں انہوں نے بڑی چالاکی اور عیاری کے ساتھ اپنے قدم آگے بڑھائے۔ ایک طبقہ تو صدر صاحب کے ساتھ چمٹا رہا اور اُنہیں غلط سلط مشورے دیکر اُن سے بڑے عاقبت نا اندیشانہ کام کرواتا رہا۔ دوسرا طبقہ اِن مشوروں کی تائید کے ساتھ نشر و اشاعت کے سارے سرکاری اور غیر سرکاری اداروں اور درس گاہوں میں نفوذ کر گیا اور وہاں اس نے حکومت کے وسائل کو غیر اسلامی افکار پھیلانے اور نئی نسل کو گمراہ کرنے میں بے تحاشا استعمال کیا۔ تیسرا طبقہ عوام میں سرایت کرنے لگا اور اس نے انہیں اپنی محرومیوں کا احساس دلا کر ان کے اندر اشتعال پیدا کیا۔ جو کمیونسٹ حکومت کے ایوانوں میں گھسے ہوئے تھے انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ مزدوروں میں سوائے ان کے ہم مشربوں کے کسی دوسرے کے لیے کام کرنے کے مواقع قطعاً باقی نہ رہے۔ آمریت نے جو احمقانہ روش اختیار کر رکھی تھی اُس نے بھی اشتراکی حربوں کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے زمین ہموار کی۔ کسی جائز مطالبے کے حصول کے لیے کسی معقول بات کی پذیرائی نہ کی گئی۔ بلکہ ہر معقول مطالبہ حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا گیا۔ البتہ جب اُسی مطالبے کو ہنگامہ آرائی اور لاقانونیت کے مظاہروں کے ساتھ پیش کیا گیا تو پھر اُسے درخورِ اعتنا سمجھا گیا جس کا اثر یہ ہُوا کہ ملک کی آبادی کے تمام بے چین طبقوں میں یہ احساس پیدا ہوتا چلا گیا کہ جو قیادت جس قدر شدید طوفان اُٹھا سکتی ہو اور جس قدر وسیع پیمانے پر ہنگامے کھڑے کر سکتی ہو وہی اس ملک میں مؤثر اور نتیجہ خیز کردار ادا کر سکتی ہے چنانچہ عوام میں، طلبہ میں، مزدوروں میں، اور مفلس طبقوں میں جس رفتار سے یہ احساس پیدا ہوتا چلا گیا اُسی رفتار سے وہ ایک ایسی قیادت کی طرف دیوانہ وار لپکے جو ہنگامے برپا کرنے میں زیادہ سے زیادہ مہارت رکھتی تھی۔ دوسری طرف نئی اُبھرنے والی قیادت نے بھی قوم کے اس بدلتے ہوئے مزاج کے پیشِ نظر نہ تو اُسے کوئی ٹھوس پروگرام دیا اور نہ کسی تعمیری کام کے لیے اس کی تربیت کی۔ اُس نے اُسے تشدّد، غوغا آرائی اور تخریبی کارروائیوں کے لیے تیار کرنے پر سارا زور صرف کر دیا۔ اس نئی قیادت کے ان تخریبی حربوں اور جذباتی نعروں کا ہدف سب سے پہلے خود صدر ایوب صاحب بنے اور اُن کے اپنے رفقاءِ کار اور ان کی اپنی نوکر شاہی نے ملک میں ہنگاموں اور تشدُّد کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کرا دیا۔ آخر کار فیلڈ مارشل صاحب کی آنکھیں کھُلیں اور وہ جمہوریت بحال کرنے پر آمادہ ہوئے تو معاملات اُن کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور قوم پوری طرح

ہنگامہ برپا کرنے والوں کے پیچھے لگ چکی تھی۔ قانون شکنی، خونریزی، جلاؤ گھیراؤ کے بڑھتے ہوئے رجحانات نے ملک کے اندر شدید خوف و ہراس کی کیفیت پیدا کر دی۔ معاشی سرگرمیاں معطل ہو کر رہ گئیں اور ملک ہر لحاظ سے تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ یہ حالات تھے جب مارچ ۱۹۶۹ء میں ملک کے اندر پھر مارشل لا نافذ کرنا پڑا۔ یہ عوام کی ہنگامہ آرائی اور بعض سیاسی لیڈروں کی غیر ذمہ دارانہ روش تھی جس کی بدولت ملک جمہوریت کی منزل کے بالکل قریب پہنچ کر پھر اسی جگہ پلٹ گیا جہاں وہ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تھا۔

مارشل لا کی نئی حکومت نے اگرچہ جمہوریت کی بحالی کے لیے قوم سے بڑے پُرخلوص وعدے کیے اور اُس نے ان وعدوں کا پہلا مرحلہ بلاشبہ پورا بھی کر دیا ہے مگر اُس سے بعض کوتاہیاں ایسی سرزد ہوئیں جو کافی حد تک موجودہ صورتِ حال کو پیدا کرنے کی موجب بنی ہیں۔ مارشل لا کی حکومت کے لیے دانشمندی کا راستہ یہ تھا کہ جو لوگ ملک کے امن و امان کو غارت کرنے کے ذمہ دار تھے اور ملک کی معاشی مشینری کو معطل کرنے کے درپے تھے اُن کا سختی سے محاسبہ کیا جاتا اور انہیں اس قابل نہ چھوڑا جاتا کہ وہ اس قسم کی تخریب پسندانہ کارروائیاں کرنے کی دوبارہ جرأت کرتے تاکہ ملک میں امن و امان کی ایک فضا قائم ہو جاتی اور عوام کے اندر یہ اعتماد پیدا ہو جاتا کہ اب وہ اطمینان کے ساتھ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکیں گے۔ مگر افسوس کہ حکومت نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کرنے میں سخت ٹھوکر کھائی۔ تخریب پسند عناصر کھُل کھیلنے میں بالکل آزاد رہے اور اُن سے کسی قسم کی بازپرس کرنے سے حتی الوسع اعراض کیا جاتا رہا۔

مارشل لا حکومت کو دوسرا کام یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ جلد از جلد ۱۹۵۶ء کے آئین کو بحال کر کے جمہوریت کی گاڑی کو اسی مقام پر لا کھڑا کرتی جہاں سے اُسے پٹڑی سے اُتارا گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ملک میں عام انتخابات کا اعلان کر دیا جاتا۔ مارشل لا کے آغاز میں یہ کام آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا تھا۔ اس سے آئین کا مسئلہ ایک طے شدہ مسئلہ بن جاتا، نئے نئے جھگڑوں کے اٹھنے کی راہ بند ہو جاتی، اور سب کی توجہ انتخابات کی طرف منعطف ہو جاتی۔ مگر افسوس کہ اس مشورے کو پذیرائی نہ بخشی گئی۔

نئی حکومت نے تیسری غلطی یہ کی کہ اُس نے ملک کے بہت سے ایسے مسائل کو حل کرنے کا کام اپنے

ذمہ لے لیا جنہیں حل کرنے کی نہ تو وہ استعداد اور تجربہ رکھتی تھی اور نہ اس کی غیر نمائندہ حیثیت ایسا کرنے کی مجاز تھی۔ ان مسائل میں بعض اہم آئینی مسائل کے آدھورے فیصلے بھی شامل تھے جنہوں نے پیچیدگیوں کو رفع کرنے کے بجائے اور زیادہ پیچیدہ بنا دیا۔

اس کے بعد ملک میں انتخابات کا اعلان کیا بھی گیا تو ایک نئی دستور ساز اسمبلی کے لیے کیا گیا۔ اس کے لیے تقریباً ایک سال کی طویل انتخابی مہم کا دروازہ کھول دیا گیا، اور اس مہم کو قانون و اخلاق کے حدود میں محدود رکھنے کے لیے جو ضابطہ بنایا گیا اس کی عملاً کوئی پابندی نہ کرائی گئی جس کی بدولت ناجائز ہتھکنڈوں سے انتخابات جیتنے کی کوششیں اُس سے بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ کی گئیں جو اکتوبر ۵۸ء سے پہلے کی جا رہی تھیں، بلکہ ان پر غنڈہ گردی، جھوٹے الزامات، اور گندی گالیوں کا اضافہ اتنے بڑے پیمانے پر ہوا جس کی کوئی نظیر اس سے پہلے ہمارے ملک میں نہیں ملتی۔

ان انتخابات کا جس وقت اعلان ہوا، اُس وقت ملک میں واضح طور پر تین قسم کے رُجحانات اُبھر کر سامنے آچکے تھے اور انتخابی جدوجہد کے دوران میں وہ پوری طرح زور پکڑ گئے:

ایک، علاقوں، نسلوں اور زبانوں کے تعصّبات کا رُجحان جو پاکستان کی وحدت و سالمیّت کے لیے خطرناک تھا۔ اِس رُجحان کے پیچھے اگرچہ مختلف علاقوں کی کچھ جائز اور کچھ مبالغہ آمیز شکایات مہمیز کا کام کر رہی تھیں، لیکن درحقیقت اس کی اصل قوتِ محرکہ وہ لادینیّت تھی جو قیامِ پاکستان سے پہلے ہی انگریزی دورِ حکومت میں جڑ پکڑ چکی تھی اور قیامِ پاکستان کے بعد ۲۳ سال کے دوران میں تعلیم، تہذیب، سیاست اور معیشت کے غلط نظام کی بدولت مسلسل پرورش پاتی رہی۔ تعلیم یافتہ طبقوں میں، طلبہ میں، سرکاری ملازموں میں، اور نشر و اشاعت کے وسائل میں اس نے بڑے پیمانے پر نفوذ کر لیا تھا۔ اِس رُجحان کے لوگوں نے مُلک کے مختلف حصّوں میں دوسرے علاقوں کے خلاف، اور ایک زبان بولنے والوں میں دوسری زبان بولنے والوں کے خلاف نفرت کا زہر اس شدت سے پھیلایا کہ وہ قبلِ تقسیم کی ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی باہمی منافرت کی سرحدوں کو چھو گیا۔ اس کے ساتھ کریلے اور نیم چڑھے کا مصداق یہ ہے کہ اشتراکی رجحانات

رکھنے والوں کا بھی اِس گروہ میں ایک اچھا خاصا طاقتور عنصر شامل تھا۔

دوسرا، اشتراکی رُجحان، جو پاکستان کے بنیادی نظریے ہی کو بدل کر اس ملک کو اسلام کے بجائے مارکس اور لینن اور ماؤ کے اتباع کی طرف پھیر دینا چاہتا تھا۔ یہ رجحان بھی اگرچہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہی مسلمانوں کی نئی نسل میں اپنی جڑیں پھیلا چکا تھا، اور قیامِ پاکستان کے بعد بھی کئی سال تک پھیلتا رہا تھا، لیکن پہلے کبھی اس کو یہ ہمت نہ ہوئی تھی کہ کھل کر سامنے آتا اور یہ دعویٰ لے کر اُٹھتا کہ وہ اس ملک کو ایک اشتراکی ریاست بنانا چاہتا ہے۔ یہ ہمت اُس کو اِس وجہ سے ہوئی کہ آمریّت کے دس سالوں میں اسے تعلیم گاہوں میں، مزدوروں میں کسانوں میں، نشر و اشاعت کے وسائل میں، سرکاری ملازمین میں، غرض زندگی کے مختلف شعبوں میں نفوذ کرنے کے غیر معمولی مواقع حاصل ہوئے۔ پھر عین اُس وقت جب ۱۹۶۸ء کے آخر میں ایوب خانی آمریّت کے خلاف عوامی تحریک پُورے زور کے ساتھ اُٹھی، اس رجحان کے حامی یکایک اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے اس موقع کو اپنی سالہا سال کی بوئی ہوئی فصل کاٹنے کا زرّیں موقع سمجھ کر تحریکِ جمہوریّت کو اشتراکی انقلاب کی طرف موڑنے کے لیے ہنگامے برپا کرنے شروع کر دیئے۔ اِس رجحان کے لوگوں نے کبھی کھلی کھلی اشتراکیت کی دعوت دی، اور کبھی یہ دیکھ کر کہ اِس مسلمان ملک میں یہ دعوت آسانی سے نہیں چل سکتی، اسے اسلامی سوشلزم، اسلامی مساوات، محمدی مساوات وغیرہ کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ انہوں نے عوام کو طرح طرح کے فریب دینے شروع کیے تاکہ وہ لالچ میں آ کر اِن کے آلۂ کار بن جائیں۔ کسانوں سے کہا کہ ہم ہر کسان کو ۱۲½ ایکڑ زمین دیں گے۔ کرایہ داروں سے کہا کہ ہم تمہیں اُن مکانات کا مالک بنا دیں گے جن میں تم کرائے سے رہتے ہو۔ ٹیکسیوں اور رکشاؤں کے چلانے والوں سے کہا کہ جن ٹیکسیوں اور رکشاؤں کو تم اُجرت پر چلاتے ہو وہ تمہاری ہی ملکیت میں دے دی جائیں گی۔ غریب طبقوں کے لوگوں سے وعدہ کیا کہ ہم اُن کے کچے مکان پختہ بنا دیں گے اور بڑی بڑی کوٹھیاں ان کو بانٹ دیں گے۔ مزدوروں کو امید دلائی کہ وہی کارخانوں کے مالک بنا دیئے جائیں گے۔ حد یہ ہے کہ لوگوں کو مُفت حج کرانے اور کنواروں کی شادیاں کرا دینے کے سبز باغ بھی دکھائے گئے۔ اس گروہ کی سب سے زیادہ مددگار اُس گروہ نے کی جو اخبارات میں ہزاروی گروپ کے نام سے معروف ہے۔ یہاں لوگوں نے اشتراکیوں کو

پُورا پُورا مذہبی تحفظ فراہم کیا۔ مسلم عوام کو یہ اطمینان دلایا کہ اس اشتراکیت سے اسلام کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اُن علماء کی سخت مذمت کی جنہوں نے سوشلزم کو کفر قرار دیا تھا اور انہیں امریکی ایجنٹ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ قرار دیا۔ یہ لوگ اشتراکیوں کی یہ خدمت آخر وقت تک انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ جب انہوں نے اِن کے فراہم کردہ مذہبی تحفظ سے پورا پورا فائدہ اٹھا لیا، تو سیاسی اقتدار میں اِن کو حصّہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور اس کے بعد یہ حضرات یکایک سوشلزم کے مخالف اور اسلام کے علمبردار بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔

تیسرا رُجحان پاکستان کو ایک وحدت بنا کر رکھنے اور اس کی اسلامی حیثیت کو برقرار رکھنے کا تھا، جس کی پُشت پر برِصغیر ہند و پاکستان کی پُوری اسلامی تاریخ اور روایات، قیامِ پاکستان کے اصل محرکات و اسباب، اور سب سے بڑھ کر اسلام کی تعلیمات کارفرما تھیں، اور اِس رُجحان کی طاقت کا انحصار عامۂ مسلمین کے اسلامی جذبات پر تھا جو اُن کے اندر بگاڑ پیدا کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود اب بھی خدا کے فضل سے کافی مضبوط ہیں۔

اب ایک نگاہ ڈال کر یہ بھی دیکھ لیجیے کہ انتخابات کے موقع پر اِن رُجحانات کی حامل کون کون سی اور کتنی پارٹیاں میدان میں آئیں اور ان کی پوزیشن کیا تھی۔

پہلے اور دوسرے رُجحان کی حامل مشرقی پاکستان میں چھ پارٹیاں تھیں۔ ایک عوامی لیگ دوسری نیپ (ولی خاں گروپ) تیسری نیپ (بھاشانی گروپ)، چوتھی پاکستان نیشنل لیگ (عطاء الرحمٰن گروپ)۔ پانچویں کرشک سرامک پارٹی چھٹی جمعیت علماء اسلام (ہزاروی گروپ) کی مشرقی پاکستانی شاخ جو اسلام کا نام لینے کے ساتھ بنگالی قوم پرستی کی بھی حامی تھی اور مذکورۂ بالا جماعتوں کے اندر اشتراکی رجحانات رکھنے والے عناصر کو بھی مذہبی تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ اِن میں سے چار پارٹیاں انتخابات سے پہلے ہی میدان سے ہٹ گئیں۔ صرف ولی خان گروپ نے مشرقی پاکستان کی ۱۶۲ نشستوں میں سے ۶۳ کے لیے اپنے آدمی کھڑے کیے اور ان کے لیے بھی کامیابی کے امکانات مفقود تھے اس طرح عملاً پورے مشرقی پاکستان میں صرف ایک ہی پارٹی اِن رُجحانات کی علمبردار کی حیثیت سے انتخابات میں مقابلہ کر رہی تھی، اور وہ تھی عوامی لیگ جس نے مشرقی پاکستان کی تمام نشستوں پر اپنے آدمی کھڑے کیے تھے۔ سرکاری ملازمین کی عظیم اکثریت اس کی

حامی تھی۔ طلبہ، نوجوانوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک مضبوط گروپ اس کے ساتھ تھا، مالی وسائل اس کے پاس اس قدر بے تحاشا تھے کہ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ صرف پاکستانی صنعتکار و سرمایہ دار اتنے وسائل مہیا کر سکتے تھے، ہندو ووٹ دہندگان بالاتفاق اس کی تائید کر رہے تھے، ان میں کسی کا ووٹ بھی کسی ایسی پارٹی کی طرف جانے والا نہ تھا جو پاکستان کی وحدت اور اس میں اسلامی نظام قائم کرنے کی حامی ہو، اور پورے دو سال کے دوران میں نہ صرف بیرونی ذرائعِ نشر و اشاعت سے، بلکہ خود حکومت کے رویّہ سے بھی یہ بات عوام کے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ یہی پارٹی برسرِ اقتدار آ رہی ہے۔

مغربی پاکستان میں ان رجحانات کی حامل سات پارٹیاں تھیں۔ ایک عوامی لیگ جس نے یہاں برائے نام صرف سات آدمی کھڑے کیے تھے اور ان کے لیے کامیابی کے امکانات کا سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا۔ دوسری نیپ بھاشانی گروپ جس نے پورے مغربی پاکستان سے صرف پانچ آدمی کھڑے کیے۔ تیسری سندھ متحدہ محاذ جس کا صرف ایک آدمی سندھ سے کھڑا ہوا یہی حال چوتھی پارٹی نیپ (پختونستانی گروپ) اور پانچویں پارٹی بلوچستان متحدہ محاذ کا بھی تھا کہ ان کا بھی صرف ایک ہی ایک آدمی میدان میں آیا۔ چھٹی پارٹی نیپ (ولی خاں گروپ) نے پنجاب سے کوئی آدمی کھڑا نہیں کیا، سندھ سے وہ صرف ۲ آدمی لے کر آئی، اور اس نے اپنی تمام تر توجہ سرحد اور بلوچستان تک محدود رکھی۔ اس طرح عملاً پنجاب اور سندھ ان رجحانات کی حامل پارٹیوں میں سے صرف ایک پارٹی، پیپلز پارٹی کے لیے مخصوص ہو گئے جہاں اس کا اپنے ہم مشربوں سے اگر کوئی مقابلہ تھا بھی تو وہ برائے نام تھا۔ "غریب نواز" سوشلسٹ اور بڑے بڑے صنعتکار، سرمایہ دار، جاگیردار اور وڈیرے اس کی حمایت پر جمع تھے۔ قادیانیوں کی پوری جماعت نے اپنے زیرِ زمین اور بالائے زمین سرکاری و نیم سرکاری اور غیر سرکاری سب وسائل اس کو کامیاب کرانے کے لیے صرف کر دیئے۔ اسلامی حکومت جن جن کی نگاہ میں بھی ناقابلِ قبول تھی، وہ سب بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو گئے۔ عوام میں سوشلزم اور نام نہاد "اسلامی سوشلزم" کے خلاف نفرت، جو اس کی راہ میں کانٹے بن سکتی تھی، اس کو دور کرنے میں ہزاروی گروپ کے علماء نے بیش بہا خدمات انجام دیں اور اس گھاٹ پر قادیانی اور "ختم نبوت" کے علمبردار ایک ساتھ پانی پیتے نظر آئے۔ غریب طبقوں کو جس بڑے پیمانے پر دھوکے دیئے گئے ان کے کچھ نمونے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ رہا پیسہ، تو وہ اس پارٹی نے پچھلے پورے دو سال میں جس بے تحاشا طریقے سے استعمال کیا اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ صرف پاکستانی ذرائع سے اتنے مالی وسائل بہم پہنچ سکتے تھے۔

اس کے بعد ذرا ان لوگوں کا حال بھی دیکھ لیجیے جو پاکستان کی وحدت و سالمیت اور اس کی اسلامی حیثیت کی حفاظت کے لیے اٹھے تھے۔ ان کے سامنے یہ بات ایک حقیقتِ واقعیہ کی حیثیت سے موجود تھی کہ مخالف رجحانات کی تمام طاقتیں مشرقی پاکستان میں صرف عوامی لیگ پر، پنجاب و سندھ میں تمام تر پیپلز پارٹی پر، اور سرحد و بلوچستان میں نیپ ولی خان گروپ پر مجتمع ہیں لیکن یہ دیکھتے ہوئے